اسلام کا نظریہ سیاست عصری تناظر میں

عقیل احمد

ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

ABSTRACT:

politics means to reform the society and serve the masses. Islam gives the complete guidance in every way of life, determined the clear rules in this regards. There are different ruling systems all over the world, but two are much known, firs is democracy and the second is kingship. Kingship or dictatorship prevailed in the Muslim countries, whereas the Western countries and some of the Muslim countries settled their ruling system according to democracy. In this articale an attempt was made to highlight the Islamic concept of politics especially in the modern age, and also point out the major elements of Islamic Politics.

صنعتی اور سائنسی انقلابات کے بعد جہاں نئے نئے علوم وفنون متعارف ہوئے اور تمدن کے انداز از سرِ نو ترتیب پائے وہاں اندازِ حکمرانی میں بھی تبدیلیاں آئیں اور اس کیلئے نئی نئی اصطلاحیں وضع ہوئیں۔ جس میں سب سے زیادہ پذیرائی جمہوریت کو حاصل ہوئی۔ ہر خطے میں حکمرانی کے پیچھے وہاں کے جغرافیائی، ثقافتی، مذہبی اور تہذیبی روایات کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ اس لئے جمہوری طرزِ حکومت پر ملک چلانے والوں میں بھی یکساں نظام رائج نہیں ہے۔ دنیا میں اس وقت دو طرح کے نظام حکومت رائج ہیں۔ ملوکیت اور جمہوریت، ملوکیت زیادہ تر اسلامی ملکوں میں رائج ہے جہاں کئی دہائیوں سے چند خاندان حکومت کو صرف اپنا حق سمجھتے ہیں اور عوام کو اس میں شامل نہیں کرتے جب کہ مغربی ممالک میں اور بعض اسلامی ممالک میں جمہوری نظام رائج ہے۔ جس کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک صدارتی اور دوسرا پارلیمانی، اسلام سیاست کے حوالے سے کیا فکر دیتا ہے زیرِ نظر مقالہ میں اسی بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سیاست کا معنی ومفہوم

لسان العرب اور تاج العروس کے مطابق سیاست کی تعریف یہ ہے:

والسياسة القيام علىٰ شئى بما يصلحه والسياسة فعل السأس.(۱)

''کسی چیز کی اصلاح کیلئے کھڑے ہوجانے کا نام سیاست ہے اور سیاست مدبر یا قائد کے کام کو کہتے ہیں''

ابن قیم، جوزی، امام شافعی اور ابن عقیل کے حوالے سے سیاست کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فقال الشافعي: لاسياسة الا ما وافق الشرع فقال ابن عقيل السياسة ما كان فعلا يكون معه الناس اقرب الى الصلاح وابعد عن الفساد.(۲)

''امام شافعی نے کہا کہ سیاست وہی (قابل قبول) ہے جو شریعت کے مطابق ہو۔ ابن عقیل نے کہا کہ سیاست وہ کام ہے جس میں عوام کو بہتری کے قریب اور فساد سے دور کر دیا جاتا ہے''

ابن قیم اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

أن مقصوده اقامة العدل بين عباده وقيام الناس بالقسط.(۳)

''یعنی سیاست کا مقصد لوگوں کے درمیان عدل کو قائم کرنا اور ان کو عدل کے لیے کھڑا کرنا ہے''

امام راغب سیاست کے بنیادی عناصر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس کے تین ارکان ہیں جو یہ ہیں:

عمارة الارض.

زمین کو آباد کرنا۔

تنفيذ احكام الله.

اللہ کے احکام کو نافذ کرنا۔

مكارم الشريعة.(۴)

اخلاق فاضلہ اختیار کرنا۔

مذکورہ بالا تعریفات سے واضح ہوا کہ اسلام کے نزدیک سیاست احکام الٰہی کی تنفیذ اور عوامی حقوق کی نگہبانی کا نام ہے اور یہ کام یعنی سیاست کرنے کا اہل وہی ہے جو مقاصد شریعت سے کما حقہ آگاہ ہو۔

اسلام کا نظریہ سیاست

دین اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے تمام شعبہ ہائے زندگی کیلئے واضح اصول متعین کیے ہیں تا کہ کسی بھی نظام کی ترتیب و تشکیل کیلئے اُن کو مضبوط بنیادیں فراہم ہوسکیں سیاسی نظام کی تشکیل کیلئے بھی اسلام نے ایسے ضوابط متعین کئے ہیں کہ اگر اُن کو کسی بھی معاشرے میں نافذ کر دیا جائے تو وہاں سیاسی استحکام حاصل ہوسکتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن وحدیث نے جزئیات وتفصیلات کی بجائے اُن نکات کی صورت میں رہنمائی دی ہے جس سے ایک بنیادی ڈھانچہ قائم ہوسکے اور اُس پر عمارت ''عرف'' کے مطابق قائم کی جاسکے یہی اسلام کی خوبصورتی ہے کہ اُس نے زندگی گزارنے کیلئے کسی بھی معاشرے کے عرف یعنی اُن کے عمومی معاملات جو شریعت سے متصادم نہ ہوں کو اہمیت دی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے سیاست یعنی مصالحت عامہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک انفرادی طور پر غیر سرکاری سطح پر اپنے وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے سماجی محرومیوں کا ازالہ کرنا وہ کسی بھی طرح سے ہوسکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اصلاح احوال کا مکمل ایک نظام نافذ کیا جائے جو بغیر حکومت کے ممکن نہیں کیونکہ قوت نافذہ کا حصول حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ایک معتدل اور صالح نظام کے نفاذ کیلئے مدینہ منورہ میں حکومت کی تاکہ دنیا کو سیاست کا نبوی منہاج دکھایا جاسکے۔

اسلام نے حکمرانی کیلئے خلافت کا اُصول دیا ہے تاکہ حاکم کو یہ احساس رہے کہ وہ زمین پر آمر مطلق (Dictator) نہیں بلکہ عوامی فلاح و بہبود کیلئے احکام الٰہیہ کی تنفیذ کرنے والا ہے اس ضمن میں ابن خلدون لکھتے ہیں:

''جب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ خلافت کی حقیقت دینی حفاظت اور دینوی سیاست کیلئے صاحب شرع کی جانشینی ہے اور شارع علیہ السلام کو دونوں باتوں کا اختیار حاصل ہے اور وہ دونوں میں تصرف فرماتے ہیں دینی تصرف تو تکالیف شرعیہ کے تقاضوں کے مطابق جن کی تبلیغ کا آپ کو حکم ہے اور جن پر آپ لوگوں کو آمادہ ہوتا ہے اور دنیوی تصرف اجتماعی زندگی میں لوگوں کی مصلحتوں کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے تاکہ نظام زندگی کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے انسانی زندگی کیلئے تمدن اور تمدن کی مصلحتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ تمدن میں خلل پیدا ہوکر انسانی زندگی کو خطرہ لاحق ہوجائے گا سلطان اور اس کا اقتدار ان مصلحتوں کے حصول کیلئے کافی ہے البتہ اگر حکومت آئین وشرع کے مطابق چلائی جائے تو بے حد پائیدار اور کامل ثابت ہوتی ہے کیونکہ صاحب شرع لوگوں کی مصلحتوں سے بہت خوب واقف ہیں ایسی حکومت آئین وشرع پر چلائی جانے کی وجہ سے خلافت کہلاتی ہے کیونکہ کوئی حکومت اس وقت خلافت یا خلافت کے تابع کہلاتی ہے جب کہ اس کا نظام اسلامی ہو اگر اس کا تعلق مذہب سے نہ ہو تو وہ پھر تنہا حکومت ہے خلافت نہیں'' (۵)

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن وسنت پر مبنی نظام حکومت کو خلافت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے لیکن خلافت اور جمہوریت میں کیا فرق ہے اور کیا ان نظاموں کا آپس میں کوئی ربط ہے اس کے جواب میں پہلے جمہوریت کی تعریف کو دیکھا جائے گا جمہوریت کی تعریف میں تمام مفکرین نے اس تعریف پر اتفاق کیا ہے کہ اس سے مراد عوامی حکومت ہے جو اُن کے حقوق کی نگہبانی کرتی ہے دورِ حاضر میں عوامی آراء یعنی ووٹ کے ذریعے لوگوں کا اقتدار میں آنا ہی جمہوری طریقہ کہلاتا ہے بعد میں نظام حکومت کو عوامی مزاج کے مطابق طے کیا جاتا ہے۔ خلافت کا نظام تو قرآن وسنت پر مبنی ہوتا ہے لیکن کیا اس میں بھی عوامی آراء کا خیال رکھا جاتا ہے اس حوالے سے حضرت عمر فاروقؓ نے ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''مسلمان آپس میں ایک جسم ہیں اگر اس جسم کے ایک حصے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کا دوسرا حصہ بھی اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے اسی طرح مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کے کام ذی رائے اصحاب کے مشوروں سے انجام پذیر ہوں عام لوگ اس شخص کے تابع ہیں جس کو انہوں نے والئی حکومت قرار دیا ہے اور اس کو پسند کرتے ہیں

اور جو والئی حکومت ہے وہ ذی رائے اصحاب کے تابع ہے‘‘(٦)

حکومتی معاملات میں عوامی آراء اور دورِ جاہلیت اور اسلام اس کا کتنا دخل تھا اس ضمن میں ابن خلدون لکھتے ہیں:

’’جب دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلی اور بادشاہت کی جگہ خلافت آئی تو تمام ملکی مسائل رائے عامہ سے جو طبعی تقاضوں کے مطابق ہیں حل کیے جانے لگے کیونکہ ملکی نظام برقرار رکھے بغیر تو چارہ کار ہی نہیں عہد جہالت میں پورے ملک پر سلطانی رائے کا تسلط تھا لیکن عہد اسلام میں رائے عامہ کا رواج ہوا چنانچہ رحمت عالم صحابہ کرام سے ہر چھوٹے بڑے ملکی معاملات میں پیشہ آمدہ مہمات میں مشورہ فرمایا کرتے تھے۔(٧)

جمہوریت اور خلافت دونوں میں عوامی آراء کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن مغربی جمہوریت میں آراء کیلئے حدود و قیود کا تعین نہیں افراد کی آراء اگر الہامی و انسانی اصولوں کے خلاف بھی ہوں تو قانون کا حصہ بن سکتی ہیں جبکہ خلافت میں آراء کو الہامی و انسانی اصولوں کے مطابق پیش کرنے کا تعین کیا گیا ہے۔

سید سلیمان اشرف بہاری اسلامی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسلامی سیاست کے چار ارکان ہیں۔

١۔ عوامی رائے کو معاملات حکومت میں شامل کیا جائے۔

٢۔ قانون کی بالادستی ہو۔

٣۔ عسکری قوت اس قدر ہو کہ دشمن حملہ کی جرأت نہ کر سکے اس کو مولانا بہاری نے سیاست کا جزو اعظم قرار دیا ہے کیونکہ اگر عسکری اور دفاعی اعتبار سے حکومت کمزور ہو گی تو حکومت کے جانے کا خطرہ ہوگا اگر حکومت چلی گئی تو ریاست بھی جائے گی اور ریاست کے بغیر نظریہ کا اطلاق کس پر ہوگا؟

٤۔ خارجی و اندرونی سازشوں اور فتنوں سے ریاست کو بچانے کے لیے ایک مؤثر نظام قائم کیا جائے۔(٨)

اسلام نے اہل اقتدار کے حوالے سے جانبین یعنی خیر و شر سے حکومت کرنے والوں کا ذکر کیا ہے خیر کے حوالے سے حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلمانؑ، سکندر ذوالقرنین اور نبی کریم ﷺ کا ذکر ہے جبکہ شر کے حوالے سے نمرود فرعون وغیرہ کا ذکر ہے۔

حضرت یوسفؑ نے جب اپنے آپ کو اقتدار کے لیے پیش کیا تو دو باتیں فرمائیں۔

انی حفیظ علیم.(٩)

’’بیشک میں حفاظت کرنے والا اور علم والا ہوں‘‘

یعنی ریاست کی آبادکاری کے لیے احکامات الٰہیہ کا علم اور بیت المال اور عوام کے حقوق کی حفاظت کیلئے امین ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح طالوت کو جالوت پر غلبہ کے بعد اقتدار ملا تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وزادہ بسطة فی العلم والجسم واللہ یوتی الملکہ من یشا واللہ واسع

علیم.(۱۰)

''اور زیادہ دی ہے اُسے کشادگی علم میں اور جسم میں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''

اس میں بھی دو نکات کا ذکر کیا گیا ہے علم اور جسم، علم سے مراد وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے جسم سے مراد یعنی اتنا قوی ہو کہ معاشرتی خرابیوں کو ختم کرنے کیلئے بھرپور توانائیوں سے کام لے۔

حکومت عطاء کرنے کے حوالے سے قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ زمین کا مالک رب ہے جسے چاہیے اقتدار عطا کرے اور جسے چاہے نہ دے ارشاد ہوتا ہے۔

قل اللّٰھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشا وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شی قدیر.(۱۱)

''فرما دیجیے کہ اللہ بادشاہ ہے ملک کا جسے چاہے ملک عطا کرے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے تیرے ہاتھ ہی میں خیر ہے اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے''

اقتدار ملنے کی اصل وجہ اللہ کی عطا ہے اور اسی کے ذریعے اللہ عزت وذلت بھی دیتا ہے حصول اقتدار کے بعد جنہوں نے اپنی حکومت کی بنیاد خیر کو بنایا ان کو عزت ملی اور جنہوں نے شر کو بنیاد بنایا ان کو ذلت ملی شر کی بنیاد پر جنہوں نے حکومت کی ان کا طرز حکومت اور مفاسد بھی ذکر کئے گئے اور خیر کی بنیاد پر حکومت اور اس کے ثمرات کا بھی ذکر کیا گیا تا کہ حکومت واقتدار کی خواہش رکھنے والے دینی نقطہ نظر کو سمجھ سکیں یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ:

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یر ثھا عبادی الصلحون ان فی ھذا لبلٰغا لقوم عبدین.(۱۲)

''اور ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے یقیناً اس میں عبادت کرنے والوں کیلئے پیغام ہے''

اب ایک طرف تو ارشاد ہے کہ اللہ جسے چاہے حکومت دے اور دوسری طرف وارث یعنی مالک ہونا صالحین کو قرار دیا جارہا ہے بظاہر ان میں فرق نظر آرہا ہے جب کہ فی الحقیقت فرق نہیں دراصل زمین کے وارث حقیقی تو صالحین ہی ہیں اور اگر عادلانہ نظام ہو تو یہی لوگ اقتدار میں بھی آئیں چونکہ عدل اجتماعی کے فقدان کی وجہ سے وہ لوگ جو اس کے وارث نہیں وہ غاصبانہ طریقے سے اقتدار پر قبضہ کرتے ہیں اور صالحین کا حق غصب کرتے ہیں۔ تاریخ عالم غاصبانہ طریقے سے اقتدار پر آنے والوں کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ صالحین کے زمین کے وارث ہونے کی وجہ ان کے فکر وعمل کا وہ صالح نظام ہے جو رب کریم کو مطلوب ہے اور اسوۂ رسول ﷺ ہے اسی صالح نظام کو وہ زمین پر نافذ کرنے کے بھی خواہاں رہتے ہیں لیکن غاصبوں کی تعداد ہر دور میں صالحین سے زیادہ رہی ہے وہ ان کو صالح نظام رائج کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ

رہے ہیں۔

زمین کے ان وارثوں سے اللہ کا وعدہ بھی ہے کہ:

وعداللّٰہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم.(۱۳)

''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے کہ وہ انہیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسا کہ انہیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے''

وعدہ الٰہی کے باوجود بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ صالح عمل والے اہل ایمان کو زمین پر غلبہ عطا نہیں ہوتا تو اس کا بھی یہی جواب ہے کہ ان کے اقتدار میں رکاوٹیں ڈال دی جاتی ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ان کو شہید بھی کر دیا گیا۔ اللہ نے تو ان کو غلبہ عطا کر دیا تھا کیونکہ ان کے بعد بھی ان ہی کے فکری نظام کا غالب رہنا وعدہ الٰہی کی طرف اشارہ ہے۔

جب صالحین کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی تو ان ہی کا پیش کردہ نظام نافذ ہو گا جیسے کہ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام نے جب ایک صالح نظام نافذ کرنا چاہا تو بادشاہ رکاوٹ نہیں بنا تو نظام نافذ بھی ہوا اس کے ثمرات سے لوگ مستفید بھی ہوئے اسی طرح خلفاء راشدین نے بھی صالح نظام نافذ کیا۔

اس حوالے سے ایک مثال اور دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما من دآبة فی الارض الاعلی اللّٰه رزقها.(۱۴)

''اور زمین پر ہر جاندار کی روزی اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے''

دنیا میں کئی انسان ایسے ہیں جو خوراک، دوا اور بنیادی ضرورتوں کے فقدان کی وجہ سے لقمہ اجل بن جاتے ہیں حالانکہ ان کی ربوبیت کرنے والی ذات اللہ کی ہے اور وعدہ الٰہی بھی ہے تو اب کیا یہ کہا جائے گا کہ اللہ کے وعدہ کے باوجود ان تک روزی نہیں پہنچتی تو اس ضمن میں یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ اللہ کریم نے تو ہر انسان کی روزی کا سامان وافر زمین میں مہیا کیا ہے۔ اب سرمایہ دار لوگ اگر ضرورت مندوں تک اللہ کی نعمتیں نہ پہنچنے دیں تو بات وعدہ الٰہی کے خلاف نہیں تو جس طرح اسباب و وسائل کے غاصبین حقداروں تک ان کا حق نہیں پہنچنے دیتے اسی طرح اہل طاقت حقداروں کو حکومت و اقتدار تک پہنچنے نہیں دیتے۔

اسلامی سیاست کو تین مرکزی شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) مقننہ (۲) عدلیہ (۳) انتظامیہ ذیل میں ان کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

مقنّنہ (مجلس قانون ساز)

مجلس قانون ساز اسلامی ریاست کا رُکن اعظم ہے۔

کوئی بھی ریاست یا ادارہ بغیر قانون کے ایسے ہی ہے جیسے روح کے بغیر جسم۔حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک تمام انبیاء کرام کو وحی، صحیفہ یا کتاب کی صورت میں جو احکام ملتے تھے وہ زندگی گزارنے کے قوانین کا مجموعہ بھی ہوتے تھے قرآن کریم اس کی زندہ مثال ہے شریعت اسلامی کا بنیادی ماخذ قرآن ہے اور اس کی عملی تصویر اسوہ رسول ہے قرآن نے دو طرح کے قوانین دیئے ہیں۔

ا۔عمومی ۲۔خصوصی، عمومی اصول یا قوانین کا ہر انسان اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اطلاق کرسکتا ہے جبکہ خصوصی قوانین کسی خاص موقع یا مخصوص مقاصد، وقت یا افراد کیلئے ہیں مثال کے طور پر احکامات الٰہیہ کا نفاذ، عدل اجتماعی، اور اسلامی سزاؤں کا نفاذ کا حکم ان کا تعلق حکام سے ہے افراد سے نہیں عوام کا اس ضمن میں یہ کام ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو مسندِ اقتدار پر فائز کریں جو احکامات الٰہیہ کی تنفیذ کا کام کریں۔انہی کیلئے قرآن کریم نے ''اولی الامر'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے جب با قاعدہ مدینہ منورہ کی صورت میں ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو آپ نے ایک میثاق تشکیل دیا جس سے آپ کی ایک ریاست کے داخلی، خارجی امور میں بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

عہد رسالت میں تو قانون سازی کیلئے حتمی فیصلہ نبی کریم ﷺ ہی کرتے تھے لیکن کئی معاملات میں آپ اکابر صحابہ کی آراء بھی لیتے اور بعض دفعہ اُن کی رائے کے مطابق ہی فیصلہ کرتے۔قانون سازی کرنے کا حق اسلام نے اُن ہی لوگوں کو دیا ہے جو علم وتقویٰ کے اعتبار سے لائق ہوں۔صحابہ کرام کو نبی کریم ﷺ نے علم وتقویٰ کے اعتبار سے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرتی اصلاح کرسکیں۔قرآن کریم میں اس ضمن میں ارشاد ہوتا ہے۔

وشاورھم فی الامر.(۱۵)

''اور ان سے معاملات میں مشاورت کیجئے''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وامر ھم شوری بینھم.(۱۶)

''اور اُن (مسلمانوں) کے معاملات مشاورت سے حل ہوتے ہیں''

نبی کریم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ ہی میں مشاورتی عمل کی اساس رکھی یہی فکر خلافت راشدہ میں بھی نظر آتی ہے جب بھی کوئی معاملہ درپیش ہوتا تو ارباب حل وعقد کی کمیٹی اس پر اپنی سفارشات دیتی جس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا۔خلفائے راشدین ہر کام کا فیصلہ خود نہیں کرتے تھے اُن کے اس طرزِ فکر وعمل سے آمرانہ سوچ کی نفی ہو جاتی ہے۔نبی کریم ﷺ جب عمال کو مقرر کرتے تو ان کا با قاعدہ انٹرویو کرتے ان کے کردار سے تو آپ بخوبی واقف ہوتے لیکن پیش آمدہ مسائل کے حل کیلئے انہوں نے کیا فکری نظام ترتیب دیا ہوتا اس کو جانچنے کے بعد فیصلہ کرتے اس کی واضح مثال حضرت معاذ بن جبلؓ کی تقرری ہے۔(۱۷)

اسلامی ریاست میں قانون ساز اداروں کا اختیار لامحدود نہیں کہ وہ جو چاہیں قانون بنا ڈالیں۔ نہ ہی وہ اس بات کے مجاز ہیں کہ کتاب وسنت کے خلاف کوئی قانون ترتیب دیں۔ ان کی ذمہ داری قوانین الٰہیہ کو جدید انداز میں پیش کرنے کی ہے۔

عہد جدید میں شورائی نظام کی جدید شکل پارلیمنٹ ہے جو مجلس قانون ساز ہے جہاں ممبران کو عوام الیکشن میں منتخب کرتے ہیں یہاں جدید پارلیمانی نظام کے دو پہلو قابل غور اور اصلاح طلب ہیں۔ (۱) انتخابی نظام (۲) ممبران کی عملی وعلمی حیثیت، جدید انتخابی نظام اور ممبران شوریٰ کی علمی وعملی حیثیت پر تنقید کرتے ہوئے علامہ غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''پاکستان میں انتخابات کے موقع پر ہر حلقہ انتخاب سے بکثرت امیدوار از خود کھڑے ہو جاتے ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے اپنے لئے کنویسنگ کرتے ہیں اور مخالف امیدواروں کی کردار کشی کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں غیبت، افتراء اور تہمت کی تمام حدود کو پھیلانگ جاتے ہیں اور یہ طریقہ اسلام میں بالکل ناجائز ہے۔ درحقیقت پاکستان کے آئین میں طلب منصب کی اجازت دینا ہی غیر اسلامی دفعہ ہے جو امیدوار انتخاب کے لئے کھڑے ہوتے ہیں انہی امیدواروں میں سے صدر مملکت، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ اور دیگر وزراء کا انتخاب ہوتا ہے اور یہی امیدوار اسمبلی میں جا کر کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ملک کے سربرآوردہ علماء اور دانشوروں پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل اتفاق رائے سے کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کرتی ہے لیکن وہ اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک قومی اسمبلی اس کو منظور نہ کرے اور قومی اسمبلی کے لئے، اسلامی علوم یا مروجہ علوم میں سے کسی علم کی کوئی شرط نہیں ہے نیکی اور تقویٰ کی، سیاسی تجربہ اور تدبر کی، حتیٰ کے مرد ہونے کی بھی کوئی شرط نہیں ہے، ہر فاسق وفاجر، جاہل اور ناتجربہ کار شخص خواہ مرد ہو یا عورت، انتخاب کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے اور پیسہ اور اثر ورسوخ کے زور پر اسمبلی میں پہنچ کر صدر مملکت، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ یا کسی بھی محکمہ کا وزیر بن سکتا ہے اور وہ علم، تجربہ اور اچھے کردار کے بغیر کسی اسلامی نظریاتی کونسل کی پیش کردہ سفارشات کو مسترد کر سکتا ہے اور کسی بھی قانون کے اسلامی، غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے'' (۱۸)

علامہ سعیدی موجودہ طریقہ انتخابات کی اصلاح کیلئے امیدواروں کیلئے یہ شرط مقرر کرتے ہیں کہ وہ ایم عربی، ایم اے اسلامیات یا کسی اعلیٰ دینی ادارے سے فارغ التحصیل ہو اور ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ امیدوار خود نہ کھڑا ہو بلکہ پارٹی کھڑا کرے اور اس کا تعارف وکنویسنگ خود کرے اور اس پر آنے والے اخراجات امیدوار سے وصول کئے جائیں۔ (۱۹)

سعیدی صاحب کا یہ لکھنا کہ ممبران کی تعلیم کے لئے ایم اے عربی واسلامیات یا مدرسے کا پڑھا ہونا ضروری قرار دیا جائے۔ اس کے ساتھ اگر دور جدید کے رجحانات کے مطابق شعبہ سماجیات وعمرانیات کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو عصری تقاضوں اور ''عرف'' کا ادراک بھی ممکن ہو سکے گا اور قانون سازی میں آسانی ہو گی۔

جہاں تک اُمیدوار کو خود اپنے آپ کو پیش کرنے کا سوال ہے تو جس طرح تمام اداروں میں مختلف عہدوں کیلئے لوگ اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں اور اس پر اعتراض نہیں ہوتا تو اس طرح الیکشن میں بھی امیدوار اگر اہل ہو اور موجودہ خرابیوں

سے کما حقہ اجتناب کریں تو اپنے آپ کو کسی عہدہ کے لئے پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ صرف اسمبلی کا رکن بننے سے اقتدار نہیں ملے گا اگر امیدوار کی جماعت اکثریت سے جیتے گی تو اقتدار ملے گا اس کے بعد پارٹی اہلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر عہدہ دے یا نہ دے وہ اس کی صوابدید پر ہوگا۔

یہاں ایک بات اور بھی قابل غور ہے جب مجلس قانون ساز کا ممبر بننے کے لئے تعلیم کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے تو وہ لوگ جو ان کو منتخب کرتے ہیں ان کی بھی تعلیم کم از کم اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اچھے و برے، عالم و جاہل، خائن اور دیانتدار میں فرق کر سکیں۔ پاکستان میں مروجہ جمہوری نظام کے تحت جب الیکشن ہوتے ہیں تو ہر وہ شخص جس کا ووٹ بنا ہوتا ہے اُن میں اکثریت تعلیم و شعور سے بہرہ مند نہیں ہوتی۔ اور وہ بجائے میرٹ کے پارٹی، برادری، مسلک، نسل اور علاقہ کی بنیاد پر ووٹ دے دیتے ہیں۔ جس کے نتائج کچھ خوشگوار سامنے نہیں آئے۔ مغربی معاشروں میں عوام کی اکثریت سو فیصد کے قریب تعلیم یافتہ ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے جمہوری نظام کے مطابق ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ان کے اور ریاست کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق وہاں کے ریاستی اداروں کا منظم طریقے سے کام کرنے سے عیاں ہے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشروں اور بالخصوص پاکستان کی اکثریت عالمی معیار تعلیم کے مطابق مغرب سے بہت پیچھے ہے جب کہ ووٹ کا حق ہر شخص ایک مخصوص عمر کے بعد حاصل کر لیتا ہے۔ اب ووٹ تو ہے لیکن تعلیم کا بھی فقدان ہے تو وہ سیاسی نمائندے جو مجلس قانون ساز یعنی اسمبلی کے ممبر بننے کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ ان کو بہلا پھسلا کر ووٹ لے لیتے ہیں اور منتخب ہو کر رکن اسمبلی بن جاتے ہیں اور کارکردگی نہیں دکھا پاتے جو عوام کو مطلوب ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ووٹ ڈالنے والے کا بھی تعلیم یافتہ ہونا ضروری قرار دیا جائے تا کہ وہ اس مقدس کام کے لئے کسی فریب کا شکار نہ ہو سکے۔

عدلیہ

اسلامی ریاست کا دوسرا ستون عدلیہ ہے۔ عدلیہ کا کام صرف سزاؤں کی تنفیذ نہیں ہے بلکہ اس کا کام ریاست کے تمام شعبہ جات میں توازن رکھنا ہے۔ اسلام کے عدالتی نظام میں قانونی، معاشی اور سماجی عدل سرفہرست ہیں۔ عدلِ اجتماعی ہی سے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں سہولت ممکن ہوتی ہے۔ اسلام نے اس حوالے سے باقاعدہ ایک نظام ترتیب دیا ہے جس میں قاضی کے اوصاف، عدلیہ کا اختیار، قانون الٰہیہ کے مطابق فیصلہ کرنے اور نہ کرنے والوں کیلئے وعد وعید جیسے امور موجود ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فا ولئک ھم الکفرون.(۲۰)

''اور جو فیصلہ نہ کرے اللہ کے نازل کئے ہوئے (حکم) کے مطابق وہی لوگ کافر ہیں''

دوسری آیت میں فرمایا:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فا ولیک ھم الظلمون.(۲۱)

''اور جو فیصلہ نہ کرے اللہ کے نازل کئے ہوئے (حکم) کے مطابق وہی لوگ ظالم ہیں''

اس پہلو پر تیسری آیت میں فرمایا:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفسقون.(۲۲)

''اور جو فیصلہ نہ کرے اللہ کے نازل کئے ہوئے (حکم) کے مطابق وہی لوگ فاسق ہیں''

ان آیات میں قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق کہا گیا ہے کافر سے تو بات واضح ہے کہ جو احکامات الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں اور ان کے مسلمہ ہونے پر عقیدہ نہیں رکھتے رہے ظالم اور فاسق تو ایک مسلمان جو قانون الٰہی کو حتمی بھی مانتا ہو لیکن فیصلہ اس کے مطابق نہ کرے یہاں اُنھی کے ظلم وفسق کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کی امثال ماضی میں بھی مسلمان کہلوانے والے حکمرانوں کے طرزِ حکومت سے واضح تھیں اور دورِ حاضر میں بھی موجود ہیں۔

انتظامیہ

اس سے مراد وہ ادارے ہیں جو ریاستی معاملات آئینی وعدالتی احکام کے مطابق منظم طریقے سے چلاتے ہیں تاکہ ریاست کو ترقی وخوشحالی کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔اداروں کے استحکام اور فعالیت کیلئے ضروری ہے کہ اس میں حکومتی اور سیاسی مداخلت نہ ہو۔ ہر ادارہ اپنی حدود کے مطابق کام کرے تو جلد ہی اس کے ثمرات عوام تک پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے ادوار میں یہی اصول کارفرما تھا کہ ہر ادارہ ایک ضابطے کے مطابق کام کرے اور دوسرے کے معاملات میں دخیل نہ ہو اور جو فرائض اس کے ذمے ہیں وہ بغیر کسی خوف کے ادا کرے لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے حقوق وفرائض کا تعین ہو۔ جس میں تمام ادارے شامل ہوتے ہیں جب تک اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا ادراک نہ ہو گا معاملات درست طور پر نہیں چل سکیں گے۔حضور اکرم ﷺ جب بھی کسی کو کسی علاقے یا ادارے کیلئے اہم منصب پر فائز کرتے ساتھ ہی ہدایات بھی دیتے جو ایک طرح سے اس کی حدود ہوتی تاکہ اہل اختیار اپنی حدود سے تجاوز نہ کریں۔قرآن کریم میں اس ضمن میں ارشاد ہوتا ہے:

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوالزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر.(۲۳)

''وہ لوگ جن کو زمین میں اقتدار ملتا ہے تو وہ نماز قائم کرتے ہیں زکوۃ ادا کرتے ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں''

اس آیت کی روشنی میں منتظمین کے تین فرائض سرفہرست نظر آتے ہیں (۱) اقامت صلوٰۃ کا نظام قائم کرنا اس میں تعلیم، تربیت، اخلاق وکردار، نظم وضبط، ذمہ داریوں کا احساس دلانا، اطاعت امیر جیسے امور شامل ہیں۔(۲) زکوٰۃ ادا کرنا اس شعبہ میں ریاست کے تمام مالی ومعاشی معاملات آجاتے ہیں کہ کسی طرح زکوٰۃ کی وصولی کر کے اس کو مستحقین تک پہنچانا ارتکاز زر کو روکنا معاشی خرابیوں کو دور کرنا، نظام معیشت سے غیر شرعی لین دین سود، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کا خاتمہ کرنا

شامل ہے۔(۳) خیر کا فروغ اور شر کا کا سد باب، اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ محکمہ سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ مذکورہ بالا دو احکام کی ترویج کے پیچھے بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ یہ شعبہ ریاست سے غیر شرعی رسوم ورواج کا خاتمہ کرکے پاکیزہ زندگی کا تصور دیتا ہے اس شعبہ کے ذیلی شعبوں میں پولیس اور احتساب کا ادارہ سرفہرست شامل ہیں۔ جرائم اور کرپشن کی روک تھام کرکے نظام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ جیسی خیر کی فکر کو فروغ دیتے ہیں امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں دورِ جدید میں مسلم معاشروں میں سوائے چند ایک کے یہ تینوں شعبے کمزور نظر آتے ہیں۔ نہ نظام صلوٰۃ کی روح پر غور کرکے تعلیم وتربیت کا جدید منہاج وضع کیا گیا نہ نظام زکوٰۃ کی حکمت کو سمجھتے ہوئے دنیا کے سامنے اسلام کا معاشی نظام پیش کیا گیا اور نہ خیر وشر کے اسلامی تصور کو منطقی اور انسانی رویوں کے مطابق پیش کیا گیا۔

اسلام کے سیاسی نظام میں حکمران کو لامتناہی اختیارات حاصل نہیں ہوتے اور نہ ہی عوام کو ایسی خواہشات کو قانون بنانے کی خواہش کا اظہار کرنے کی اجازت ہے جو احکام الٰہی سے متصادم ہوں۔ مغربی نظام حکومت میں حاکم صرف عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے جبکہ اسلامی نظام حکومت میں حاکم نہ صرف عوام بلکہ خدا کے سامنے جوابدہی کا تصور بھی موجود ہے جوابدہی کا مضبوط تصور ہی کارکردگی کو فعال بناتا ہے۔

سیاست اسلامی کا مقصد اصلاح، خدمت، ہمدردی، مساوات، رواداری، تہذیب فکر وعمل جیسے اعلیٰ اصولوں کو فروغ دینا ہوتا ہے اور یہ اصول مؤثر مقننہ، منصف مزاج عدلیہ اور فعال ومستعد انتظامیہ کے بغیر ممکن نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ الافریقی، محمد بن مکرم ابن منظور، لسان العرب، جلد ۶ ص ۱۰۸ قم ایران ۱۴۰۸ھ

(ب) زبیدی، مرتضیٰ حسین، تاج العروس، جلد ۴ ص ۶۴، ادارالاحیاء التراث العربی، بیروت، س۔ن

۲۔ الجوزی، محمد بن قیم، الطرق الحکمۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، ص ۲۴۔ ۲۵، دارالاحیاء العلوم بیروت، ۲۰۰۲ء

۳۔ ایضاً

۴۔ اصفہانی، امام راغب الذریعہ الی مکارم الشریعہ باب ۸، ص ۱۸ بحوالہ، اسلامی سیاست، گوہر رحمٰن، دارالعلوم تفہیم القرآن مردان طبع اول ۱۹۸۱ء

۵۔ ابن خلدون، عبدالرحمٰن، مقدمہ ابن خلدون، مترجم راغب رحمانی دہلوی نفیس اکیڈمی کراچی، ص ۳۱، ۱۹۸۰ء

۶۔ ابی جعفر جریر طبری، تاریخ طبری، مترجم سید محمد ابراہیم وسید رشید احمد ارشد، جلد دوم، نفیس اکیڈمی کراچی، ص ۳۱۷، س۔ن

۷۔ مقدمہ ابن خلدون، ص ۵۵

۸۔ بہاری، سلمان اشرف، سید، البلاغ ادارہ پاکستان لاہور، ص ۱۹۔ ۱۸، ۲۰۱۰ء

۹۔ یوسف، ۵۵

۱۰۔ البقرۃ، ۲۴۸

۱۱۔ آل عمران، ۲۶

۱۲۔ الانبیاء، ۱۰۵۔۱۰۶

۱۳۔ النور، ۵۵

۱۴۔ ھود، ۶

۱۵۔ آل عمران، ۱۵۹

۱۶۔ الشوریٰ، ۳۸

۱۷۔ بخاری، رقم الحدیث

۱۸۔ سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن جلد ۵، ص: ۷۹۷۔۷۹۶، فرید بک سٹال لاہور، ۲۰۱۰ء

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ المائدہ، ۴۴

۲۱۔ المائدہ، ۴۵

۲۲۔ المائدہ، ۴۷

۲۳۔ الحج، ۴۱۔۴۲